۸

اسلام اور اسلام پسند

اسلام کے ابتدائی ایام میں جب خدا کا آخری رسول ہمارے درمیان موجود تھا کسی کو یہ بات کہنے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ وہ اسلام پسند ہے، تب فقط مسلم ہونا ایمان کے اعلیٰ ترین مدارج میں شمار ہوتا تھا۔ کسی کے لئے اس سے بڑا کوئی اور افتخار نہ تھا کہ وہ مسلم ہے یعنی ان لوگوں میں شامل جس نے الٰہ واحد کے آگے غیر مشروط سپردگی اختیار کر رکھی ہے۔ اس وقت اسلام ایک ایسے دین کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا جو بشمول محمدؐ اور ان کے متبعین تمام انبیاء سابقین کا دین تھا اور مسلم ہونے کا مطلب گروہی شناخت سے عبارت ہرگز نہیں تھا۔ انبیاء سابقین کے وہ سچے متبعین جن کے قلوب خشیت الٰہی سے لرزتے اور جن کی راتیں شب بیداری میں گزرتی تھیں، انہیں قرآن نے اگر متبعین محمد کا فطری حلیف قرار دیا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اسلام کو گروہی شناخت کے بجائے ایک عملی رویہ پر محمول کرتے تھے جس کی تصدیق خود دعویٰ کرنے والا اپنے عمل سے مسلسل کرتا رہتا تھا۔ جب تک اسلام کی یہ آفاقی تعبیر دنیا کے سامنے رہی، گم شدہ اور منحرف انسانیت کے قافلے اسلام کو اپنا نظریاتی مسکن و معدن تصور کرتے رہے، اسلام ایک نجات دہندہ تہذیب کی حیثیت سے انسانیت کی پناہ گاہ بنا رہا۔

بدقسمتی سے آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں وہاں اسلام سے کہیں زیادہ اسلام ازم کا غلبہ ہے۔ مسلمانوں میں ایک قابلِ ذکر طبقہ ایسے افراد کا پیدا ہو چلا ہے جو خود کو فقط مسلمان کہنے پر قانع نہیں، اس کا اصرار ہے کہ اسے اسلام پسند کہا اور سمجھا جائے۔ بیسویں صدی میں مسلم معاشرے میں اسلام کو دوبارہ منشور عمل بنانے کے سلسلے میں جو مختلف قسم کی تحریکیں چلتی رہی ہیں جسے بالعموم اسلامی بیداری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس نے پوری دنیا میں بظاہر باشعور مسلمانوں کا ایک ایسا حلقہ پیدا کر دیا

ہے جو خود کو اسلام پسند کہنے پر فخر کرتے اور اس لیبل کو اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں میں اسلام پسندوں کے ایک طبقۂ امتیاز کا پیدا ہو جانا یا امت مسلمہ کے اندر الگ سے کسی جماعت المسلمین کی ترتیب و تنظیم کے اسرار و عواقب کے سنگینی کا اب تک پورے طور پر ادراک نہیں کیا جا سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بالعموم گزشتہ صدیوں میں مسلم معاشروں میں برپا ہونے والی مختلف تحریکوں کے نظری محاکمے کے بجائے اسے محض ایک مستحسن اقدام کے طور پر دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ چند صدیوں میں برپا ہونے والی مختلف تحریکوں نے امت کو آج جہاں پہونچایا ہے وہاں کسی فکری مرکزیت کے بجائے فکری افتراق و انتشار کا سماں عام ہے۔ مسلمانوں کے مختلف گروہ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ ہر ایک کو اس بات کا دعوی ہے کہ اسلام کی اصل تشریح و تعبیر بس اس کے ہاتھ لگی ہے۔ رہے وہ اسلامسٹ جن کا کل فکری سرمایہ بیسویں صدی کے بعض شارحین کی تصنیفات ہیں تو وہ اس بات کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے کہ اسلام کو منشور عمل بنانے کے لئے برسوں کی جدو جہد اگر مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر رہی ہے تو کم از کم اس پر تنقیدی نگاہ ہی ڈال لیں۔ فکری اور عملی انتشار کے اس دور میں جب کہ عام ذہنوں میں اسلام اور اسلام پسندی دونوں ایک دوسرے سے خلط ملط ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کا جاری زوال روکے نہیں رُک رہا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ روایتی انداز کا شور و غوغا جاری رکھنے کے بجائے ہم اپنے طریقۂ کار کا سخت تنقیدی محاسبہ کریں۔

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینی ہے کہ اسلام اور اسلام پسندی، جس پر بظاہر ایک ہی شئے کا گمان ہوتا ہے، دراصل اپنی ماہیئت میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جہاں اسلام ایک ایسا نظریہ ہے جو تمام عالم انسانیت کی حریت اور اس کے نجات کا علمبردار ہے وہاں اسلام پسندی قومی مسلمانوں کا سرمایۂ افتخار ہے۔ اسلام ان تمام سعید نفوس کا دین ہے جو خدائے واحد کی اتباع کا دم بھرتے ہیں اس کا کوئی تہذیبی اور ثقافتی قالب نہیں، یہ ایک ایسا کھلا دروازہ ہے جہاں شکست خوردہ انسانیت کے قافلے بلا امتیاز نسل و وطن تسکین و نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام پسندی یا اسلام ازم کی تحریک دراصل کلونیل عہد میں مسلم دانشوروں کے response سے عبارت ہے۔ خلافت عثمانی کے سقوط اور مسلم اکثریتی علاقوں پر اقوام یوروپ کے سیاسی تسلط کے خاتمے کے لئے مختلف خطوں میں جو تحریکیں چلیں ان میں اسلام کا حوالہ پایا جانا فطری تھا۔ البتہ یہ تمام تحریکیں ایک استبدادی نظام کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آئی تھیں، اس لئے اس کے نظری اور عملی قالب اپنی مقامی ضرورتوں کے تابع تھیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلم ممالک سے استبدادی نظام کے خاتمے میں اسلام نے ایک کلیدی رول ادا کیا لیکن اس کے باوجود اگر کوئی یہ سمجھے کہ استبدادی نظام کے خاتمہ کے لئے جو تحریکیں اٹھیں وہ عہد رسول کے اسلام کا مظہر تھیں تو ایسا سمجھنا محض خوش فہمی کہا جائے گا اور اس سے فکری التباس کی دھند مزید گہری ہوتی چلی جائے گی۔

اسلام پسندی کی تحریک کے صحیح محاکمہ کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس زمانی اور مکانی پس منظر کو بھی اپنی نگاہوں میں مستحضر

رکھیں جس میں یہ تحریکیں وجود میں آئی تھیں۔ ہندوستان میں مولانا الیاس کی تحریک ایمان، ابوالاعلی مودودی کی دعوتِ حکومت الٰہیہ اور مصر میں حسن البنا اور سید قطب کی رجوع الی الاسلام کی دعوت' جسے آج عالمی سطح پر اسلام ازم کا سب سے منظّم اظہار سمجھا جاتا ہے' دراصل خلافت عثمانی کے سقوط سے پیدا ہونے والی محرومیوں کے سد باب کی مختلف النوع کاوشیں تھیں جن پر سقوط خلافت سے پیدا ہونے والے فکری اور سیاسی بحران کا سایہ پڑنا فطری تھا۔ ان حضرات کی یہ کوشش رہی کہ فی الفور مسلمانوں کا سیاسی ڈھانچہ کسی نہ کسی طرح قائم کر دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ خلافتِ عثمانی کا سقوط کیوں اور کیسے ممکن ہوا' کہ اجنبی اقوام ہماری سرزمینوں پر اس طرح قابض ہوتی چلی گئیں' تو ان خطرناک سوالات کو فرصت کے اوقات کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ مولانا الیاس کی تحریکِ ایمان نے چند مبادیات کو لے کر دیکھتے دیکھتے حیرت انگیز طور پر ایک عالمی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اسلام ازم کی تمام شکلیں خواہ ان پر سیاسی قالب کا گمان ہوتا ہو یا سیاست سے دور محض تزکیہ و تربیت کو وہ اپنا ہدف قرار دیتی ہوں، واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام تحریکیں اس آفاقی اسلام کی نمائندگی نہیں کرتیں جو عہد رسول کے اسلام کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ اگر ایک طرف تصوف زدہ دینی تحریکوں میں ترکِ دنیا کا رجحان غالب رہا تو دوسری طرف اسلام کو سیاسی نظریے کے طور پر پیش کرنے والی تحریکوں نے اسلام کو ایک ایسے نظریہ کے طور پر متعارف کرایا جو مسلم قوم کے سیاسی غلبہ کو یقینی بناتا تھا یا کم از کم جو اقوام مغرب کے مقابلے میں مسلمان کی نظری پناہ گاہ تھا۔ ایک ایسا اسلام جسے مسلم قوم کے فکری قلعہ کی حیثیت حاصل ہو، جو اقوام مسلم کے سیاسی غلبہ کا زینہ سمجھا جاتا ہو، بھلا کسی ایسے اسلام میں دوسری قوموں کے لئے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ پھر کچھ عجب نہیں اگر آج بھی اسلامسٹ آئیڈیالوجی کو اہل مغرب اپنے لئے موت کا سامان سمجھتے ہوں۔

ایک ایسے وقت میں' جب عالمی ذرائع ابلاغ میں ہماری تصویر مسخ کر دی گئی ہو' مسلم اہل فکر کے لئے یہ سوال بہت اہم ہے کہ اسلام کو دوبارہ ایک آفاقی نظریہ کے طور پر کس طرح پیش کیا جائے جس میں تمام اقوامِ عالم اپنی نجات و فلاح کا سامان پاتے ہوں۔ آج مغرب میں جو لوگ تہذیبی جنگ کا بگل بجا رہے ہیں وہ غلط فہمیوں کی پیدا کردہ اس صورت حال سے حتی المقدور فائدہ اٹھانے کے لئے کوشاں ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک تہذیبی جنگ میں خود کو الجھانے کے بجائے ایک ایسے اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے خود کو پیش کریں جس میں تمام اقوام عالم کے لئے نصح و خیر خواہی اور نجات کی بشارت پائی جاتی ہو۔ مگر مشکل یہ ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں، بالخصوص مسلم ممالک میں، اسلامی بیداری کی تحریکیں جس طرح اسلام کو قومی سرمایہ کی حیثیت سے برتنے کی عادی رہی ہیں اور جس طرح اسلام پسند حضرات مسلمانوں کے مابین خود کو ایک باشعور طائفہ کے طور پر پیش کرتی رہے ہیں ان کے لئے فی الفور اپنے عمل کا محاسبہ کرنے اور آفاقی اسلام کے قالب کو تشکیل دینے میں کچھ وقت لگے گا۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران مصر،

الجزائر، تیونس اور شام میں اسلامی تحریکیں قومی مسلمانوں سے نبرد آزما رہی ہیں۔ اسلام پسندوں اور روایتی مسلمانوں کے مابین اس معرکہ آرائی نے جس بڑے پیمانے پر عرصے سے کشت وخون کا بازار گرم کر رکھا ہے اس کے نتیجے میں اب یہ احساس عام ہو رہا ہے کہ مسلم معاشرہ میں اسلام کی بازیافت کا یہ طریقۂ کار شاید کچھ مناسب نہیں۔ الجزائر میں پہلے مرحلہ میں انتخابی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے اسلام پسندوں کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ یہ اس ملک کا آخری الیکشن ہے، اسلام پسندوں کے اقتدار میں آجانے کے بعد یہاں کسی الیکشن کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی، تو اس وقت اس قسم کے انتہا پسندانہ بیانات کے اسر اوعواقب کا صحیح اندازہ لگانے میں ہم سے چوک ہوئی۔ اسلام پسند مذہبی طائفے بالعموم اپنے ایمان کے آگے دوسروں کے ایمان کو لائق اعتناء نہیں سمجھتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی جو تشریح وتعبیر ان کے ہاتھ آئی ہے بس وہی احق ہے اور اس پر بزور بازو لوگوں کو عامل کرانے کے لئے وہ من جانب اللہ مامور کئے گئے ہیں۔ بیسویں صدی میں نوآبادیاتی نظام کی رخصتی کے بعد مختلف دینی تحریکوں کو اسلام کی تعبیر کے سلسلے میں یہ غلط فہمی رہی اور جس کی وجہ سے مسلم معاشرہ خانہ جنگی کا شکار رہا۔ اس کی جڑیں حال میں نہیں بلکہ ماضی بعید کے تہذیبی اور تعبیری ادب سے جا ملتی ہیں جس کے نقد واصلاح کے بغیر مستقبل میں آفاقی اسلام کے قالب کی تشکیل ممکن نہیں۔

مسلمانوں میں کسی ایسے طائفہ کا پیدا ہو جانا جسے فقط اپنی تفہیم وتعبیر پر اصرار ہو اور جو دوسروں کی فہم وبصیرت کو ہرگز خاطر میں نہ لاتا ہو کوئی نیا عمل نہیں ہے جس کے لئے صرف عہد جدید کے اسلام پسندوں کو مورد الزام سمجھا جائے۔ طالبان کے افغانستان میں جہاں ایک عرصہ بعد امیر المؤمنین کی اصطلاح کا احیاء ہوا اور مسلمانوں کو ایک امیر کی اتباع میں اسلامی زندگی جینے کا موقع فراہم کیا گیا وہاں اس بات پر شدید اصرار رہا کہ حلقۂ دیوبند کی حنفی تعبیر کے علاوہ کسی دوسری تفہیم وتعبیر کو ہرگز لائق اعتناء نہ سمجھا جائے۔ ان اسلامیوں کے زیر تسلط اہل قبلہ کے دوسرے گروہ سخت گھٹن کے شکار رہے۔ اسلامی بیداری کی تحریکیں اگر مسلم اکثریتی ملکوں میں بھی کسی اسلامی نظام کے قیام میں ناکام رہیں تو اس کا بنیادی سبب بھی یہی تھا کہ وہ قدیم اسلام ازم یعنی فقہی گروہ بندیوں کے ازالہ کے بجائے نئی فکری گروہ بندیوں کو جنم دے رہی تھیں۔ انہوں نے خوابیدہ فقہی گروہ بندیوں کو تو دبانے کی کوشش کی البتہ وہ غیر محسوس طور پر نئے فکری انتشار وافتراق کا سامان کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف اخوان المسلمین کی مرکزی تنظیم سے مختلف چھوٹی بڑی جماعتیں وجود میں آگئیں جنہیں محض اپنے فہم کی صداقت پر اصرار تھا اور جو اسے بزور بازو نافذ کرنا اپنا دینی حق سمجھتی تھیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ اسلام پسندوں کے ایک گروہ کے نزدیک دوسرا گروہ گمراہ قرار پایا اور متشدد ین نے ان کا خون مباح کر لیا۔

فی زمانہ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور مغرب کے مابین حیات وموت کا معرکہ برپا ہے۔ خاتمۂ دہشت کے عنوان

سے مغربی اقوام کا افغانستان اور عراق پر قابض ہو جانا یقیناً ایک سنگین صورتِ حال ہے لیکن اس سے بھی کہیں خطرناک صورتحال یہ ہے کہ دنیا کو ہوس ملک گیری اور منظّم امریکی دہشت گردی سے نجات دلانے کے لئے آخری رسول کے متبعین غیر موثر نظر آتے ہیں۔ کیا ہم اب بھی اس حقیقت کے ادراک سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں کہ طالبان کے سقوط میں شمالی اتحاد نے کلیدی رول ادا کیا تھا اور عراق میں اجنبی اقوام کے قدم جمنے میں شیعہ وسنی کے مابین پائی جانے والی فکری خلیج نے بنیادی رول ادا کیا ہے۔ ہم اس تلخ حقیقت سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ ہمارے زوال کا سوتا ہمارے اندرون سے بہتا ہے۔ ہماری شکست کے محرکات ہمیشہ ہمارے اندرون میں پائے گئے ہیں سو جب تک اس اندرونی خلفشار کا علاج نہیں ہو جاتا' کامیابی کبھی بھی ہمارا مقدر نہیں بن سکتی۔

ہم من حیث الامۃ بیک وقت دو بڑے مسائل سے دوچار ہیں۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ مختلف جارح اقوام ہمیں منتشر اور پراگندہ حال سمجھ کر ہم پر حملہ آور ہوگئی ہیں لیکن اس سے کہیں بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم اپنے فکری انتشار کی وجوہات کے واقعی ادراک میں ناکام ہیں۔ ہم صدیوں پر مشتمل فکری پراگندگی کا قلع قمع کرنے کی خود میں جرأت نہیں پاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ روشن مستقبل کا کوئی منصوبہ ابتدائی مراحل میں صرف اس لئے دم توڑ دیتا ہے کہ ہم فقہی خانوں میں مختلف طور سے صدیوں سے بٹے چلے آتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ صدیاں گزر جانے کے بعد ہماری انحراف فکری کو ایک طرح کا اعتبار اور سند حاصل ہو گیا ہے جس کی تلافی کی کوئی کوشش ہمیں اب اجنبی معلوم ہوتی ہے۔

بھلا اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اسلام جو ابوالانبیاء ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے' اس کی تفہیم و تکمیل کا تمام تر کام آپ ؐ کی حیات مبارکہ میں انجام پا چکا' اس کے بعد آگے جو کچھ بھی ہے وہ انسانوں کی بنائی ہوئی تاریخ ہے۔ فقہاء کا ظہور، ان کی گروہ بندیاں، تشریح و تعبیر کی کتابوں کا لکھا جانا، غور و فکر کے لئے درس و ارشاد کی مسندوں کا قائم ہونا یہ سب کچھ یقیناً مستحسن اقدام ہیں لیکن انہیں جزو دین نہیں قرار دیا جا سکتا۔ حیرت ہے کہ بعض سیاسی عوامل کی وجہ سے نویں صدی میں چار فقہی مسالک کو اعتبار مل جانے سے انہیں اب تعبیر دین کے کلید کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس سے بڑی حیرت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو امت دنیا کو الٰہ واحد کی بندگی کی طرف بلاتی رہی ہو، خود اس کی سب سے محترم مسجد حرم مکی میں نویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی تک بیک وقت چار فقہاء کے مصلے قائم رہے اور اس انتشار فکر و عمل پر کسی کی جبیں شکن آلود نہ ہوتی ہو، حالانکہ ان صدیوں میں ہمارے درمیان بڑے بڑے نابغۂ عصر علماء و مفکرین پیدا ہوتے رہے۔ تشریح و تعبیر کے بڑے بڑے علمبردار اور نہ جانے کتنے حجۃ الاسلام کو اس دوران امت نے جنم دیا لیکن امت کے اس فکری انحراف کی درستگی کا سہرا ان بادیہ نشیں نجدی قبائل کو جاتا ہے جنہوں نے بزور بازو ان تمام فقہی نمازوں کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کو کئی صدی کے بعد کم از کم ایک مصلیپر جمع کر دیا۔ اگر بادیہ نشیں نجدی

قبائل محض اپنے ایک اصلاحی قدم سے حرم مکی سے مختلف فقہی مصلے لپیٹ سکتے ہیں تو عہد جدید کے باشعور مصلحین ہمارے فقہی تشتّت کا خاتمہ کیوں نہیں کر سکتے۔ شیخ بلقینی کہتے ہیں انہوں نے اپنے عہد میں اپنے استاد سے پوچھا کہ ہمارے عہد کے فقہاء خود کو چار فقہاء میں سے ہی کسی ایک کا خود کو پروردہ کیوں گردانتے ہیں، وہ اپنی علیحدہ فہم وبصیرت کا اعلان کیوں نہیں کرتے، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے مناصب پر تقرری کے لئے انہی چار مدرسۂ فکر میں سے کسی ایک کا عالم ہونا ضروری سمجھا جاتا ہو، بلقینی کہتے ہیں شیخ یوسف مسکرائے اور انہوں نے اس خیال سے اتفاق کیا۔ جب تک فکری تشتّت کی صورتِ حال پر ہمارے اہل فکر محض تبسم فرماتے رہیں گے اصلاحِ احوال کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔